

علی اکبر ناطق کی ناول نگاری: سماجیاتی مطالعہ

Sociological Study of Ali Akbar Natiq's Novel Writing

Muhammad Idrees

PhD Urdu Scholar National College of Business Administration and Economics Multan

midrees122310325@ncbaemultan.edu.pk

Dr. Rafia Malik

Department of Urdu National College of Business Administration and Economics Multan

rafiamalik7151@gmail.com

Abstract

This research paper presents a comprehensive sociological study of contemporary Urdu fiction through an analytical critique of Ali Akbar Natiq's seminal novels, Noolakhi Kothi and Kumari Wala. Utilizing a realistic narrative approach and a sharp stylistic execution termed "Nok Nigari", Natiq meticulously uncovers the structural injustices, class struggles, and institutional decay within the Subcontinent, particularly Punjab. Through Noolakhi Kothi, the study explores the sociological impacts of post-colonial transitions, examining how colonial stratagems transformed into modern tools of exploitation wielded by a newly emerged indigenous elite. Shifting to Kumari Wala, the paper analyzes contemporary societal degeneration from 1980 to 2020, focusing on systemic corruption, feudal tyranny, bureaucratic moral decay, and religious exploitation. By stripping away romanticized depictions of rural life, this paper highlights Natiq's profound ability to mirror the eroding foundational human values under social pressures, positioning his work as a vital sociological document of regional socio-political evolution.

Keywords: Ali Akbar Natiq, Sociological Analysis, Urdu Fiction, Post-Colonialism, Structural Injustice, Feudal Tyranny, Socio-Political Realism

علی اکبر ناطق عصر حاضر کے ایک ایسے توانا تخلیق کار اور دانشور کے طور پر ابھرے ہیں جنہوں نے اپنی نظم و نثر، تنقیدی مقالات اور اخباری کالموں کے ذریعے بہت قلیل عرصے میں ادبی دنیا میں اپنی دھاک بٹھادی ہے۔ ان کی حال ہی میں منظر عام پر آنے والی آپ بیتی "آباد ہوئے برباد ہوئے" نے ادبی حلقوں میں ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا ہے۔ اگرچہ اب تک ان کے صرف دو ناول ہی منظر عام پر آئے ہیں، لیکن یہ دونوں اپنی فکری گہرائی، منفرد اسلوب اور اچھوتے موضوعات کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے پہلے ناول "نو لکھی کوٹھی" نے شائع ہوتے ہی تہلکہ مچا دیا اور اس کی شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ تقسیم ہند کو بنیاد بنا کر لکھا گیا یہ ناول محض ایک تاریخی واقعہ تک محدود نہیں رہتا، بلکہ پاکستان کے بننے کے بعد پیدا ہونے والے سماجی و سیاسی مسائل کے گرداب کو بھی نہایت مہارت سے اپنے کینوس میں سمونے ہوئے ہے۔

ناول "نو لکھی کوٹھی" کی کہانی برطانوی راج کے ان آخری ایام کی عکاسی کرتی ہے جب نوآبادیاتی نظام اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور برصغیر کے عوام میں سیاسی و سماجی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ ناطق نے اس عہد کی زندگی کے کڑوے حقائق کو نہایت پیمائی اور دلیری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے برطانوی تسلط کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ان تلخیوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے جو مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اچانک پیدا ہوئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خونخونی فسادات میں بدل گئیں، جس کے نتیجے میں لاکھوں انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ اس عمل میں ہندوؤں کی اس ہوشیاری اور چالاکی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جس کے ذریعے انہوں نے سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا اور اہم علاقوں کو بھارت میں شامل کرانے میں کامیاب رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب نوآباد کاروں نے ایک منظم منصوبے کے تحت پورے ہندوستان کو آگ اور خون کے کھیل میں دھکیل دیا۔ برطانوی سامراج کی یہ شعوری کوشش تھی کہ ان کے جانے کے بعد یہاں سے ابھرنے والی ریاستیں مستحکم نہ ہو پائیں۔

اس حوالے سے محمد علی صدیقی کا یہ قول نہایت اہم ہے:

"سیاسی نوآبادیاتی نظام کے جلو میں ادبی نوآبادیاتی نظام نے محکوم قوم کے احساس کمتری میں شدت پیدا کی۔ اور خصوصیت کے ساتھ مشرق میں وہ انھیں پتھیل پیدا ہوئی کہ ہم مغربی روح، مزاج، نظریہ کائنات اور نسلی یادوں کا ساتھ دینے بغیر ان کے استعارات، تشبیہات اور علامتوں کو اپنے 'حرف خاص' کی طرح گرداننے لگے۔" (۱)

انگریزوں کے رائج کردہ تعلیمی نظام اور ادب کے اثرات سے نکلنے میں ہندوستانی قوم کو کئی دہائیاں لگیں۔ ۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تو آزادی کی تحریک میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا، تاہم ہندوؤں اور مسلمانوں کی منزلیں جدا ہو چکی تھیں۔ اس نازک موڑ پر دوسری جنگ عظیم نے انگریزوں کی ترجیحات بدل دیں، جبکہ ہندوستانی اسے آزادی حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع سمجھ رہے تھے۔ ناول کے پلاٹ میں ہمیں آزادی کے متوالے، مزاحمت کار، امن پسند اور متشدد، ہر طرح کے کردار نظر آتے ہیں۔

ناطق نے ولیم کے کردار کو مرکزی حیثیت دی ہے، جو برصغیر کی سیاسی و سماجی صورتحال کو سمجھنے کے لیے ایک کلیدی کردار ہے۔ ولیم ایک ایسا انگریز ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور اسی مٹی کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ وہ یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے مخلصانہ اقدامات کرنا چاہتا ہے، جس کی وجہ سے اسے اپنے خاندان اور دیگر انگریز افسران کی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ مقامی دیہاتیوں کے لیے اسکول بنانے کی بات کرتا ہے تو اس کی ماں اسے خبردار کرتے ہوئے کہتی ہے:

"حنانے ایک نظر ولیم کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور بولی ولیم میرا خیال ہے تمہیں کبھی سے زیادہ ان کالوں کی فکر ہے۔ تم ان کے بارے میں حاکم بن کر کیوں نہیں سوچتے۔ جانسن صاحب تمہارے بارے میں بہت فکر مند ہیں وہ کہہ رہے تھے فیروز پور سے بھی ان کی رپورٹس اچھی نہیں آرہیں اور یہ کہ ولیم گورنمنٹ سے زیادہ رعایا کا وفادار ہے۔ اس بات کے اثرات اس کی ملازمت پر برے پڑیں گے۔" (۲)

انگریزوں نے یہاں اپنی تہذیب مسلط کرنے کی کوشش کی، مگر دیسی ثقافت اتنی توانا ثابت ہوئی کہ اس نے انگریزی اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ ولیم جیسے کئی انگریز یہاں کی زبانوں اور کلچر میں اس قدر رچ بس گئے کہ وہ اسے اپنا گھر سمجھنے لگے۔ تاہم، ولیم کا اعلیٰ افسر جانسن اسے مسلسل یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی حکومت کا اصل سبب ہندوستانیوں کی جہالت ہے اور اسے برقرار رکھنا سامراجی مفاد میں ہے۔ جانسن کے یہ الفاظ نوآبادیاتی ذہنیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں:

"ولیم یہ ڈرائنگ روم میں جتنی تصویریں دیکھ رہے ہو۔ یہ سب آپ کے اجداد کی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کی خدمات خاندان اور گورنمنٹ کے لیے یکساں فخر کا باعث نہ ہوں۔ یہ ہندوستان جس کے رومان میں آپ مبتلا ہو۔ یہ ہمیں بھی اتنا ہی اپنی طرف کھینچتا ہے جتنا آپ کو، لیکن اس کی محبت کے کچھ آداب ہیں اور وہ آداب تمہارے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کالے اور سفید لوگوں کے درمیان ایک لکیر ہے۔ اسے جب بھی عبور کیا جائے گا۔ اسی وقت یہ زمین اپنے گلے سے ہمارے اقتدار کی رسی کاٹ دے گی۔ میں بھی اس حق میں ہوں کہ کالوں کی غربت اور جہالت ختم ہونی چاہیے۔ اسے بہت حد تک ہم نے ختم بھی کیا ہے۔ لیکن آپ کیا اس بات کو بھول گئے کہ ہماری ان پر حکومت کا سبب ان کی بھکی جہالت ہے۔ چنانچہ اسے ایک حد تک ان پر مسلط رکھنا ضروری ہے۔" (۳)

یہ سوچ محض جانسن کی ذاتی رائے نہیں بلکہ برطانوی سامراج کی باقاعدہ سفارت کاری اور حکمت عملی تھی۔ ناطق کا یہ ناول نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے ستر سال بعد بھی اس کے اثرات کے باقی رہنے کی وجوہات تلاش کرتا ہے۔ سید عامر سہیل کے مطابق، آج کے برصغیر کے ادب اور ثقافت کو نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ ناطق کے علاوہ صفدر زیدی اور یونس جاوید جیسے ادیبوں نے بھی اپنے ناولوں کے ذریعے ان محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اس صورتحال کی وضاحت یوں کی ہے:

"ہمارے دور میں بلاواسطہ نوآبادیات تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ سامراجیت جس جگہ موجود تھی اب بھی وہیں جاری ہے۔ اور سیاسی آئیڈیالوجیکل، اقتصادی اور سماجی دساتیر کے ساتھ ساتھ عمومی ثقافتی حلقے میں بھی موجود ہے۔" (۴)

ولیم کاروائی سامراجی سوچ کے خلاف مزاحمت کرنا اور ہندوستان کی ترقی کا خواہاں ہونا اسے ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ناطق کی اس تخلیق کی اہمیت اس کے سماجی شعور اور عصری مسائل کے گہرے ادراک میں پنہاں ہے۔ انتظار حسین ان کے فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علی اکبر ناطق کا فکشن حقیقت اور کہانی کے پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے وہ دیہات اور اس کے کرداروں کی بازیافت کا آدمی ہے اور حقیقی طور پر 'من آف سوسل' ہے وہ احمد ندیم قاسمی کی طرح دیہات کا رومان پیش نہیں کرتا بلکہ کرداروں کو حقیقت کی زندگی عطا کرتا ہے۔" (۵)

ناول کا ایک اور اہم پہلو مولوی کرامت کا کردار ہے جو مذہبی طبقے کے تضادات کو نمایاں کرتا ہے۔ وہی مولوی جو جدید تعلیم کے خلاف کفر کے فتوے دیتا تھا، ولیم کی طرف سے عہدے اور تنخواہ کی پیشکش ملتے ہی اپنے نظریات بدل لیتا ہے اور انگریزی تعلیم کا داعی بن جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس تلخ حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اکثر اوقات مذہبی منافرت کے پیچھے ذاتی مفادات کا فرما ہوتے ہیں۔ ولیم کی ایما پر مولوی نہ صرف گاؤں والوں کو انگریزی تعلیم پر آمادہ کرتا ہے بلکہ اپنے بیٹے فضل دین کو بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور بھیجتا ہے۔ فضل دین کی انگریز سرکار سے وفاداری اور چالوئی اس کے خاندان کے لیے مراعات کے دروازے کھول دیتی ہے اور اس کی آنے والی نسلیں بھی اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ صورتحال آج کے دور میں ان مخصوص خاندانوں کی عکاسی کرتی ہے جو نوآبادیاتی دور کی باقیات ہیں اور ملکی وسائل پر قابض ہیں۔ قیام ہند کے بحران کے دوران ان لوگوں نے ناجائز طریقے سے جائیدادیں اپنے نام کرائیں:

"مولوی فضل دین نے بھی اپنے، اپنی بیوی، ماں اور ساس کے نام کئی کئی الاٹمنٹوں کے کاغذات تیار کر کے مال روڈ پر ایک دکان، ماڈل ٹاؤن میں ایک کوٹھی، ریگیل چوک میں ایک مکان، ایک آٹے کی مل شاہ عالمی میں الاٹ کروالی۔ اس کے علاوہ روڈ کے سوا ایکڑ زمین بھی ٹھوکر کے قریب ہی، جی ٹی روڈ قریب رکھوا لی۔" (۶)

ناطق نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح قیام پاکستان کے بعد بھی وہی فیض یافتہ طبقہ انگریزوں کے ہتھکنڈوں کو استعمال کرتے ہوئے عوام کا استحصال کر رہا ہے۔ ناول میں انگریزوں کے زوال کی ایک وجہ ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی چالاکی اور ہوشیاری بتائی گئی ہے، جو اب انگریزوں سے بھی دوہاتھ آگے نکل چکے تھے۔ ولیم اس بدلتی صورت حال میں خود کو اکیلا اور بے بس محسوس کرتا ہے:

"جو مشکل سب سے اہم تھی وہ یہ کہ اب ہندوستانی بھی اب پہلے والے نہیں رہے تھے۔ اب یہ لوگ چالاکی اور عیاری میں گوروں کے بھی کان کاٹتے تھے اور اس چکر میں تھے کب انگریز یہاں سے نکلے۔ ایسے میں انھیں آزاد نہ کرنا ایسے ہی تھا جیسے بغیر ہتھیار کے بھیڑیے کے ساتھ رات گزاری جائے۔ اس ساری صورت حال میں ولیم نہ صرف ہندوستانیوں سے ناخوش تھا۔ بلکہ انگریزوں سے اور اپنے آپ سے بھی ناراض تھا۔ وہ یہ سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت تو اسے اور بھی غصہ آتا جب وہ کسی انگریز کو ہندوستان چھوڑنے کے متعلق گفتگو کرتے دیکھتا یا اسے پتہ چلتا۔ اس کا فلاں دوست اپنا بوریا بستر سمیٹ کر انگلستان جا رہا ہے۔ ولیم کا اس وقت خون کھولنے لگ جاتا تو کیا یہ سب اس کے خلاف سازش تھی۔ جس میں انگریز، مسلمان، ہندو سب شامل تھے۔" (۷)

ولیم کے نقطہ نظر کے مطابق، برطانوی راج کے خاتمے میں جہاں مقامی آبادی کا شعور شامل تھا، وہیں بعض انگریز افسران کا اپنا لالچ بھی کارفرما تھا کہ وہ نئی ریاستوں میں زیادہ آزادی سے اپنے مفادات حاصل کر سکیں گے۔ تاریخی حقائق بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ تقسیم کے بعد بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سمیت کئی افسران طویل عرصے تک یہاں خدمات سر انجام دیتے رہے۔ ناول کے دیگر کردار جیسے غلام حیدر اور سودھاسنگھ بھی تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی نفسیات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اردو ادب کے معاصر منظر نامے میں علی اکبر ناطق ایک ایسے فکشن نگار کے طور پر ابھرے ہیں جن کی تحریروں کی بنیاد ٹھوس حقیقت نگاری اور گہرے سماجی شعور پر استوار ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک انفرادی خوبی ان کی "نوٹ نگاری" ہے، یعنی وہ الفاظ اور جملوں میں ایک ایسی کاٹ اور شدت پیدا کرتے ہیں جو قاری کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑتی ہے۔ ناطق معاشرتی تضادات اور انسانی رویوں کو کسی مصلحت یا لگی لپٹی کے بغیر بے لاگ انداز میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ایک خاص قسم کی جرات اور اثر انگیزی دکھائی دیتی ہے۔ اردو فکشن میں ان کے دونوں، "نوٹ لکھی کوٹھی" اور "کماری والا"، خاص اہمیت کے حامل ہیں جن میں انہوں نے دیہی زندگی، جاگیردارانہ جبر، طبقاتی تقسیم اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار محض فرضی پیکر نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش اور سماجی حالات کے حقیقی ترجمان محسوس ہوتے ہیں۔ ناطق اپنے بیانیے میں سماجی طنز کا سہارا لے کر معاشرتی نا انصافیوں اور طاقت کے غلط استعمال کو بے نقاب کرتے ہیں۔

ان کا پہلا ناول "نوٹ لکھی کوٹھی" (۲۰۱۲ء) اپنی اشاعت کے بعد سے ہی ادبی حلقوں اور عام قارئین میں بے پناہ مقبول رہا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰۱۲ء سے ۲۰۲۰ء کے مختصر عرصے میں اس کے چھ ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں، جو اس کے بلند ادبی معیار اور قارئین کی دلچسپی کا واضح ثبوت ہے۔ اس ناول کی کامیابی کا بنیادی سبب اس کا موضوع ہے جو زندگی کے حقیقی مسائل سے بڑھا ہوا ہے۔ ناطق نے اس میں ایسی حقیقت نگاری سے کام لیا ہے کہ کردار جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے انتظار حسین رقمطراز ہیں:

"علی اکبر ناطق کا فکشن حقیقت اور کہانی کے پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ وہ دیہات اور اس کے کرداروں کی بازیافت کا عادی ہے اور حقیقی طور پر 'من آف سوائس' ہے۔ وہ احمد ندیم قاسمی کی طرح دیہات کا رومان پیش نہیں کرتا بلکہ کرداروں کو حقیقت کی زندگی عطا کرتا ہے۔" (۸)

انتظار حسین کی یہ رائے اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ ناطق دیہی معاشرت کو کسی رومانوی ملمع کاری کے بجائے اس کی اصل اور بعض اوقات تلخ صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار سماجی دباؤ اور حالات کے جبر کے تحت زندگی گزارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ساخت کے اعتبار سے یہ ناول ۵۶ حصوں پر مشتمل ہے جس کے چار بنیادی ستون ولیم، غلام حیدر، سودھاسنگھ اور مولوی کرامت ہیں۔ یہ چاروں کردار مختلف سماجی طبقات اور فکری پس منظر کی علامت ہیں۔ ولیم برطانوی استعمار کا چہرہ ہے، غلام حیدر دیہی زمینداری نظام کا نمائندہ ہے، سودھاسنگھ مقامی مزاحمت کی علامت بن کر ابھرتا ہے جبکہ مولوی کرامت مذہبی طبقے کے سماجی اثر و رسوخ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ متعدد ذیلی کردار کہانی کے تانے بانے بنتے ہیں جو مل کر ایک پورے عہد کی سماجی تاریخ اور تاریخی تبدیلیوں کو واضح کرتے ہیں۔

ناول کا کیونوس برطانوی دور حکومت سے تقسیم ہند کے لیے تک پھیلا ہوا ہے، جس میں پنجاب کی دیہی زندگی، نوآبادیاتی سیاست اور تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے تغیرات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کا آغاز ولیم سے ہوتا ہے جو انگلستان سے تعلیم پا کر ہندوستان آتا ہے۔ اس کے ذریعے ناطق نے برطانوی حکمرانوں کی اس مخصوص ذہنی ساخت کو دکھایا ہے جس میں مقامی لوگوں پر صرف حکومت کرنا مقصود تھا۔ ولیم کو اس کے اعلیٰ حکام کی طرف سے یہ نصیحت ملتی ہے کہ وہ محکوم عوام سے فاصلہ برقرار رکھے، جیسا کہ اقتباس سے واضح ہے:

"ولیم تم ایک انگریز ہو یہاں تمہاری حیثیت حاکم کی ہے ہم یہاں کی زمین سے رومانس نہیں حکومت کرنے آئے ہیں۔" (۹)

دوسری جانب غلام حیدر کا کردار اس دور کے بدلتے ہوئے دیہی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جہاں تعلیم کو سماجی ترقی کا ذریعہ سمجھا جانے لگا تھا، اسی لیے اس کے والد اسے بیرون ملک بھیجتے ہیں تاکہ وہ روایتی جاگیر دارانہ ماحول سے نکل سکے۔ تاہم، یہ کردار یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اپنی جڑوں سے مکمل انقطاع ممکن نہیں۔ اسی معاشرے میں جب غلام حیدر کے والد کا قتل ہوتا ہے، تو وہ قانونی راستے کے بجائے ذاتی انتقام کو ترجیح دیتا ہے اور سودھانگھ کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس دور کے سماج میں رائج عزت اور غیرت کے ان تصورات کی نشاندہی کرتا ہے جہاں ذاتی انصاف کو ترجیح دی جاتی تھی۔ سودھانگھ کی موت کے وقت دکھائی گئی بہادری اس عہد کے مردانہ وقار کی علامت ہے۔ ناطق اس منظر کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں:

"غلام حیدر نے سودھانگھ کے دل پر رانفل کی نال رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔ غلام حیدر نے میگزین ایک دفعہ پھر بھری تھی اس لیے وہ پوری کی پوری سودھانگھ پر خالی کر دی اس فائر کے چلنے کے ساتھ ہی خون کے تیز فوارے نے پوری چارپائی لال کر دی۔" (۱۰)

مذہبی قیادت کے حوالے سے مولوی کر امت کا کردار معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے ہوئے رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح تقسیم ہند کے واقعات ناول کا سب سے الم ناک پہلو ہیں، جہاں ہجرت، فسادات اور قتل و غارت کے ذریعے ایک بستا ہوا معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ غلام حیدر کی سرحد عبور کرتے ہوئے موت اور تقسیم کے بعد خالی ہونے والی جائیدادوں پر قبضے کے ذریعے نئی سماجی ترتیب کا ابھرنا اس دور کی تلخ سچائیاں ہیں۔ ناول کا اختتام ولیم کی تنہائی اور بے بسی پر ہوتا ہے جو سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں خود کو اپنی ہی مانوس زمین پر اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔

ناطق کا دوسرا بڑا ناول "کماری والا" (۲۰۲۰ء) موجودہ پاکستانی معاشرے کے مسائل کا آئینہ دار ہے۔ مصنف کے مطابق "نو لکھی کو ٹھی" کی مقبولیت نے ان پر ذمہ داری کا بوجھ بڑھا دیا تھا، اسی لیے انہوں نے اس ناول کو نہایت عرق ریزی سے تخلیق کیا۔ یہ ناول ۱۹۸۰ء سے ۲۰۲۰ء تک کے پاکستانی معاشرے کے مختلف پہلوؤں بشمول سیاسی انتشار، افغان جہاد کے اثرات، فرقہ واریت اور سماجی گراؤ کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں دیہی اور شہری زندگی کے تلخ پہلوؤں کو جلال دین جیسے بد عنوان سرکاری ملازم اور مدثر جیسے نشے کے عادی کرداروں کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے۔ جلال دین کی کرپشن کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

"ڈسپنری میں آنے والی دو ایکس کاغذوں میں تو مریضوں کے نام پر درج تھیں مگر حقیقت میں وہ بازار کی دکانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ غریب لوگ خالی ہاتھ واپس لوٹ جاتے اور جلال دین اپنی جیبیں بھر تارہتا۔" (۱۱)

اس ناول میں نشے کی لت، جوے، جاگیر دارانہ سنگدلی، غربت، اور معاشی ناانصافی جیسے موضوعات کو بڑی گہرائی سے چھیڑا گیا ہے۔ ندا غفار نے اس ناول کے متنوع اور تلخ موضوعات کی فہرست پیش کرتے ہوئے اسے فرقہ وارانہ جنگ، جاگیر دارانہ اصلیت، افسر شاہی کی کریبہ شکل اور تعلیمی و سماجی استحصال کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق:

"کماری والا ملک میں بڑھتی فرقہ وارانہ جنگ، جاگیر دارانہ نظام اصلیت، اسکول کے نو عمر لڑکوں کی جبری ملک فروش حرکتیں، ظالمانہ اور غیر پیشہ ورانہ سسٹم، دینی مدارس کو دشمن ممالک سے فنڈنگ، مادہ پرستی اور شوبز شمولیت کی آڑ میں جنس کا کاروبار، سیاسی چالیں، افسر شاہی کی کریبہ شکل اور گندے دھندے، کلرکوں کی غلیظ عادات، مزدور یونین کی بد معاشی، اور مزدور مخالف رویے، صحافت کے نام پر دو نمبری، مارکسی نظریات رکھنے والے کارکنوں کی فضول اور غلیظ زندگی، اپر کلاس اور ایلٹی کلاس کی بے حیائی، فیڈریوں میں مزدوروں کے ساتھ ناروا سلوک، درختوں کا کٹاؤ، انتہا پسندی، اور شہری پھیلاؤ وغیرہ ناول کے اہم موضوعات ہیں۔" (۱۲)

اتنے سنگین اور حساس موضوعات پر قلم اٹھانا علی اکبر ناطق ہی کا جگر ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ضامن علی ہے جس کی زندگی کے نشیب و فراز کے ذریعے اس عہد کی تلخ حقیقتوں کو فلیش بیک کی تکنیک میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا عنوان ایک گاؤں "کماری والا" کے نام پر ہے جہاں کی حقیقی منظر کشی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ مجموعی طور پر ناطق کے یہ دونوں ناول برصغیر اور بالخصوص پنجاب کی سماجی، سیاسی اور تاریخی تبدیلیوں کی ایک جامع دستاویزی شکل پیش کرتے ہیں۔

علی اکبر ناطق کا ناول "کماری والا" ایک ایسے بیانیے کو جنم دیتا ہے جو معاصر پاکستانی معاشرت کے تضادات، اخلاقی گراؤ اور طبقاتی کشمکش کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں ناطق نے دیہی اور شہری زندگی کے ان پہلوؤں کو چھوا ہے جہاں انسانی اقدار اور مفادات کا ٹکراؤ معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ناول کا آغاز ایک ایسی فضا سے ہوتا ہے جہاں پس ماندہ دیہات میں طبی سہولیات کا فقدان انسانی زندگیوں کے لیے مستقل خطرہ بنا رہتا ہے۔

ناول کے بیانیے میں شاداں ڈاکٹرنی کا کردار ایک مسیحا کے طور پر ابھرتا ہے، جس کی حکمت اور مہارت کے قصے دور دور تک مشہور ہیں۔ اس کے بارے میں ایک مقامی زمیندار، رحمت، کے الفاظ دیہی معاشرے میں اس کی اہمیت اور لوگوں کے اس کے ساتھ جذباتی لگاؤ کو واضح کرتے ہیں:

"اوہ اچھا آپ اس شاداں ڈاکٹرنی کی بات تو نہیں کر رہے؟ میاں بڑی سیانی حکیم ہے۔ تاپ کے کا علاج تو اس کی ہتھیلی پر رکھا ہے۔ یہ سارا ارد گرد کا علاقہ اس سے علاج کرتا ہے۔ میاں مجھے اس کا رشتہ دار ہی سمجھو، کچھ رشتے خون کے نہیں ہوتے پر خون سے بڑھ جاتے ہیں۔ میرا نام رحمت ہے۔ یہ کھوہ اور یہ ٹیوب ویل میرا ہی ہے۔ اللہ کا دیا چالیس ایکٹر زمین میں سے اٹھارہ میری ہے۔ ہر سال اس ڈاکٹرنی کو میری طرف سے پورے پانچ من گندم جاتی ہے یہ میں نے اپنی حیاتی تک اپنے آپ سے عہد کیا ہے۔" (۱۳)

یہ اقتباس جہاں دیہاتی فراخ دلی اور احسان شناسی کی تصویر پیش کرتا ہے، وہیں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ایک باشعور اور مخلص فرد کس طرح کسی پس ماندہ علاقے کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ شاداں کی آٹھ سالہ محنت نے اس گاؤں میں زچگی کے دوران ہونے والی اموات کی شرح کو ختم کر دیا تھا، جو اس سے پہلے ایک سنگین مسئلہ تھا۔ تاہم، جہاں گاؤں کی زندگی میں ایسا مثالی بھائی چارہ اور خلوص ملتا ہے، وہیں وہاں کی تلخیاں، نفرتیں اور سہولیات کی کمی بھی ایک حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔

ناول نگار نے سماجی برائیوں کی جڑوں کو بے نقاب کرنے کے لیے جلال دین جیسے کرداروں کو تخلیق کیا ہے جو سرکاری اداروں میں موجود بے حسی اور بد عنوانی کا استعارہ ہیں۔ جلال دین ایک ڈسپنسر ہے جو مستحق مریضوں کی ادویات بلیک مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے اور ہسپتال کی الکو حل کونٹے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کی اخلاقی پستی کا عالم یہ ہے کہ وہ ایک معصوم بچے کے ساتھ بد فعلی جیسے گھناؤنے جرم میں بھی ملوث ہے۔ ضامن علی جو خود ایک غریب کسان کا بیٹا ہے اور تعلیمی شعور کی کمی والے ماحول سے نکل کر اسلام آباد پہنچتا ہے، اس تمام صورتحال کا عینی شاہد ہے۔ ناطق نے مذہبی لہادے میں چھپے استحصالی عناصر پر بھی کڑی ضرب لگائی ہے۔ مولوی عبدالحی جیسے کرداروں کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح جہاد کے نام پر معصوم نوجوانوں کو ورغلا یا جاتا ہے اور ان کی ماؤں کو ذہنی و روحانی کرب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ نرس عدیلہ کی حالت زار اس جبر کی عکاسی کرتی ہے جس کا شکار یہ خاندان ہوتے ہیں:

"وہ ایک وحشی اونٹنی کی طرح دوڑی جا رہی تھی جیسے اس کے تمام حواس مختل ہو گئے ہوں اور آنکھوں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہو۔ ایک جگہ عدیلہ بیل گاڑی کے نیچے کھلنے سے بال بال بچی۔ وہ بیل گاڑی کے پیسے سے نکل کر منہ کے بل گری، گرنے سے سڑک پر پڑی اینٹ اس کے سر پر لگی اور ماتھا پھٹ گیا مگر اس نے جیسے کچھ محسوس ہی نہ کیا ہو۔" (۱۴)

یہ ناول صرف انفرادی دکھوں کی کہانی نہیں بلکہ جاگیر داری نظام کی سفاکی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے خاندانی بگاڑ کا نوحہ بھی ہے۔ ڈاکٹر فرح کا کردار ایک ایسے ہی بڑے جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جہاں زمین کی ہوس میں خونی رشتے ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ فرح کے کزن طلال نے وراثت کی خاطر اپنے ہی خاندان کے لوگوں کا قتل کیا، جس کی وجہ سے فرح کو گمنامی کی زندگی گزارنی پڑی۔ مقتدر طبقے کی یہ ہوس نہ صرف خاندانوں کو تباہ کرتی ہے بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کو بھی مفلوج کر دیتی ہے۔ ناول کے آخری حصوں میں مصنف نے بیوروکریسی اور ریاستی اداروں کے اندرونی بگاڑ کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ سیکرٹری خارجہ جیسے کردار کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ذاتی مفادات، مراعات اور غیر ملکی خوشنودی کے لیے ملکی سلامتی کے حساس رازوں کا سودا کیا جاتا ہے۔ ضامن علی کا ان فائلوں تک رسائی حاصل کرنا اس بھیانک سچائی کو سامنے لاتا ہے:

"نقلیں تیار ہو کر کہاں جا رہی تھیں؟ مجھے اس معاملے میں تجس ہو اور اس تجس میں بہت سے رازوں سے پردے اٹھنے شروع ہو گئے۔ اس معاملے میں سیکرٹری صاحب کی بیٹی نویر اور بیوروکریسی کے مزید کئی لوگ شامل تھے کہ اپنے نجی مفادات پر ملک نامی بکرے کو ذبح کیا جا رہا تھا۔ پھر اگلے چھ ماہ کے دوران ہی مجھے سمجھ آگئی کہ وہ تمام کام جنہیں ہمارے حکمران یا سیاستدان کرنا چاہتے تھے انہیں بیوروکریسی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر کیسے سبوتاژ کر رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ یہ کام کسی بڑے منافع کے عوض نہیں بلکہ معمولی معاوضے، کبھی محض خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور بعض اوقات چند نجی مفادات مثلاً اختیار اور نوکری میں ترقی یا فارن ملک میں رہائش اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے انجام دیتے تھے۔" (۱۵)

مجموعی طور پر "کماری والا" عہد حاضر کے پاکستان کی ایک ایسی سماجی و سیاسی تصویر ہے جو قاری کو نظام کی خامیوں پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ علی اکبر ناطق نے بڑی مہارت سے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح کرپشن، جاگیر داری، اور اداروں کی بے حسی نے ملک کو معاشی اور اخلاقی طور پر کھوکھلا کر دیا ہے۔ یہ ناول محض ایک افسانوی تحریر نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے ان ناسوروں کی نشاندہی ہے جن کا علاج وقت کی اہم ضرورت ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، توازن کی جہات، (مرتبہ: ڈاکٹر قاضی عابد)، (ملتان: بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص: ۵۵
- ۲۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۰ء)، ص: ۲۱۴
- ۳۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص: ۲۲۴
- ۴۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، (ترجمہ: یاسر جواد)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص: ۶۶
- ۵۔ انتظار حسین، مشمولہ: نو لکھی کوٹھی از علی اکبر ناطق، بیک فلیپ
- ۶۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص: ۳۹۸
- ۷۔ ایضاً، ص: ۳۴۳
- ۸۔ انتظار حسین، مشمولہ: نو لکھی کوٹھی از علی اکبر ناطق، بیک فلیپ
- ۹۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص: ۳۲
- ۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۹۶
- ۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۴۱
- ۱۲۔ ندا غفار، علی اکبر ناطق بطور ناول نگار، مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)، گورنمنٹ صادق کالج، دویمین یونیورسٹی، بہاولپور، سیشن: ۲۰۲۱ء-۲۰۲۳ء، ص: ۹۰
- ۱۳۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص: ۱۶
- ۱۴۔ ایضاً، ص: ۵۹
- ۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۶۳

Reference in Roman:

1. Muhammad Ali Siddiqi, Dr., *Tawazun ki Jehat*, (Murattaba: Dr. Qazi Abid), (Multan: Bahauddin Zakariya University, 2007), p. 55
2. Ali Akbar Natiq, *Nolakhi Kothi*, (Jhelum: Book Corner, 2020), p. 214
3. Ali Akbar Natiq, *Nolakhi Kothi*, p. 224
4. Edward Said, *Saqafat aur Samraj*, (Tarjuma: Yasir Jawad), (Islamabad: Muqtadra Qaumi Zaban, 2012), p. 66
5. Intizar Husain, Mashmoola: *Nolakhi Kothi* az Ali Akbar Natiq, Back Flap
6. Ali Akbar Natiq, *Nolakhi Kothi*, p. 398
7. Ibid., p. 343
8. Intizar Husain, Mashmoola: *Nolakhi Kothi* az Ali Akbar Natiq, Back Flap
9. Ali Akbar Natiq, *Nolakhi Kothi*, p. 32
10. Ibid., p. 296
11. Ibid., p. 241
12. Nida Ghaffar, *Ali Akbar Natiq ba-Taur Novel Nigaar*, Maqala baraye M.Phil (Urdu), Government Sadiq College Women University, Bahawalpur, Session: 2021–2023, p. 90
13. Ali Akbar Natiq, *Nolakhi Kothi*, p. 16
14. Ibid., p. 59
15. Ibid., p. 263